رالف رسل

شادم از زندگئ خو یش

جیسا آپ کو معلوم ہے، میں یہ کتاب قسطوں میں لکھ رہا ہوں۔ ہر قسط لکھنے کے بعد میں اسے خالد حسن قادری صاحب کو تصحیح کے لیے بھیجتا ہوں۔ پچھلی قسط جب واپس آئی تو میں نے دیکھا کہ ایک جگہ حاشیے میں قادری صاحب نے کچھ لکھا ہے۔ جہاں میں نے لکھا تھا، ''رہا پروفیسر کا خطاب، جوکام میں نے شروع ہی سے سنبھالنے کا فیصلہ کیا وہ ... ایسا تھا کہ اس کے ساتھ وہ کام نہیں کرسکتا تھا جن کی بنا پر آپ پروفیسرشپ کے عہدے پر پہنچ سکتے ہیں۔'' قادری صاحب نے حاشیے میں لکھا، ''جن میں خوشامد اور چاپلوسی سرِفہرست ہیں۔'' مجھے ان کی اس بات سے پورا اتفاق ہے، لیکن یہ SOAS کے ماحول کی تصویر کا صرف ایک رخ ہے۔ پہلے اس خوشامد کے بارے میں مجھے یہ کہنا چاہیے کہ آپ کا کام زبانی خوشامد سے زیادہ عملی خوشامد سے چلتا تھا۔ مطلب یہ کہ اگر آپ ترقی کرنا چاہتے تھے تو آپ صرف وہ کام کرتے تھے جو آپ کا صدرِشعبہ اور دوسرے اربابِ حلّ و عقد سمجھتے تھے کہ آپ کو کرنا چاہیے، اور آپ وہی تعصبات اپنے اندر پیدا کرتے تھے جو ان کے تھے۔ ان میں سب سے اہم یہ تھے: مقدم کام تحقیق ہے، اور وہ بھی ایسی تحقیق جو کسی عملی کام کے لیے کسی طرح مفید نہ ہو۔ ان کے نزدیک بہترین تحقیقی مضمون وہ تھا جسے آپ کے علاوہ مشکل سے تین یا چار آدمی سمجھ سکیں۔ آپ کو پڑھائی کی کوئی خاص پرواہ نہیں کرنی چاہیے۔ اگر آپ کسی جدید زبان کے لکچرر ہوں تو اس زبان پر اپنا عبور محدود رکھیے۔ پڑھنے کی حد تک تو ٹھیک ہے، لیکن زبان روانی سے بولنا اور اپنے طالب علموں سے یہ توقع کرنا کہ وہ بھی روانی سے بولنا سیکھیں، یہ شرافت سے بعید ہے۔ کہا جاتا ہے کہ برطانیہ آزاد ملک ہے، جمہوری ملک ہے، ہر شخص کا حق ہے کہ وہ اپنی بات سوچے اور اس کا اظہار بھی کرے۔ جہاں تک SOAS کا معاملہ ہے، اس میں آپ آزاد تو تھے، لیکن آپ کو اپنی آزادی کی قیمت بھی ادا کرنی ہوتی تھی۔ بلکہ اگر میں کہوں کہ اس کی سزا بھگتنی پڑتی تھی تو بے جا نہیں ہوگا۔ لکچرروں کی بڑی اکثریت یہ سزا بھگتنے کے لیے تیار نہیں تھی اور وہ یہ سمجھتے تھے کہ خاموشی بہتر ہے۔ رہی جمہوریت، ملک میں جمہوریت ہو یا نہ ہو، SOAS میں اگر تھی تو نہایت محدود۔ ڈائریکٹر، سیکرٹری اور صدرِ

شعبہ — ہر ایک اپنے میدان میں مختارِکل تھا اور اپنے اقتدار کو قائم رکھنے کی خاطر بعض اوقات وہ بے ایمانیاں کرتا اور وہ جھوٹ بولتا کہ خدا کی پناہ۔ اس کی تفصیل میں نے ۱۹۷۳ میں ایک کتابچے ORIENTAL DESPOTISM میں (جو تقریباً ۹۰۰۰ الفاظ پر مشتمل تھا) بیان کی ہے۔ اس کے شائع ہونے کے کچھ ہی دن بعد ایک امریکی خاتون Wendy O'Flaherty جو اس زمانے میں سنسکرت پڑھاتی تھیں مجھے برآمدے میں ملیں۔ مسکرا کے مجھ سے پوچھا، "Ralph, don't you *want* to be a professor?" (''رالف، کیا آپ پروفیسر بننا نہیں چاہتے؟'')۔ میں نے کہا کہ مجھے اس کی کوئی خاص پرواہ نہیں تو ہنس کے کہا، "That figures!" (''اب بات سمجھ میں آتی ہے!'')۔

لیکن اب SOAS کے بارے میں اس سے زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں۔ جتنا اب تک میں نے لکھا ہے آپ اس کو کتاب کی تمہید سمجھیے جو اس لیے لکھی گئی کہ آپ سمجھ سکیں کہ میں نے کس ماحول میں اردو کی خدمت کرنے کی کوشش کی ہے۔

اردو سیکھنا

جب میں نے SOAS میں اردو پڑھنی شروع کی تو میں اس خوش فہمی میں مبتلا تھا کہ یہ میرے لیے بائیں ہاتھ کا کھیل ہوگا۔ ہندوستان میں میں اپنے سپاہیوں کے ساتھ اور اپنے دو ساتھی ہندوستانی افسروں کے ساتھ (محمد نواز خان، جو پٹھان تھے، اور گوپال سنگھ، جو سِکھ تھے) برابر اردو بولتا رہا تھا اور سمجھتا تھا کہ مجھے اردو اچھی خاصی آتی ہے۔ ایک حد تک یہ ٹھیک بھی تھا، لیکن میں اردو ادب سے بالکل ناواقف تھا۔ البتّہ ایک خاص قسم کی ادبی زبان سے تھوڑی بہت واقفیت تھی۔ وہ اس طرح کہ ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی نے ۱۹٤۲ کے بعد مارکس اور اسٹالن کی بعض تصانیف کے اردو ترجمے شائع کرنے شروع کیے تھے اور میں نے ان میں سے بعضوں کو ڈکشنری کی مدد سے پڑھا بھی تھا۔ پھر بھی جب اردو ادب کا مطالعہ شروع کیا تو مجھے کافی صدمہ پہنچا، اور فوراً احساس ہوا کہ مارکسزم کی زبان اور اردو ادب کی زبان میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ اتفاق سے سب سے پہلے مجھے نذیر احمد کی ''توبۃ النصوح'' پڑھنی پڑی جس کے پہلے باب کی زبان بہت سے اردو والوں کے لیے بھی کافی مشکل ہے۔ چند جملے پڑھتے ہی میں نے محسوس کیا کہ ''ہنوز دلّی دور است'' اور یہ کہ تین سال پڑھنے کے بعد اردو میں فرسٹ کلاس آنرز لانا کوئی آسان کام نہیں ہوگا۔ خیر میں کافی محنت کرتا رہا اور مجھے فرسٹ کلاس مل ہی گیا۔

اسی قسم کی خوش فہمی سنسکرت کے بارے میں بھی تھی جسے میں نے اپنے ضمنی مضمون کے طور پر اختیار کیا تھا۔ کیمبرج میں میں نے لاطینی اور قدیم یونانی پڑھی تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ یہ دونوں زبانیں گویا سنسکرت کی بہنیں ہیں۔ میرا خیال تھا کہ اس کا مطالعہ بھی میرے لیے مشکل نہیں ہوگا۔ لیکن یہ اندازہ بھی غلط نکلا۔ لگے ہاتھوں یہ بھی بتادوں کہ ان دنوں میرا خیال تھا کہ اردو اور سنسکرت پڑھنے کے بعد شمالی ہند کی دوسری زبانیں سیکھنے میں کوئی خاص مشکل نہیں ہوگی۔ جب میں نے ان ساری خوش فہمیوں کو دور کیا اور صحیح صورتِ حال سے واقف ہوگیا تو میں نے پوری تندہی کے ساتھ اپنی مشکلات کا سامنا کیا اور تین سال کی مستقل محنت کے بعد (جیسا کہ میں نے اوپر بیان کیا ہے) فرسٹ کلاس میں بی۔ اے۔ آنرز کا امتحان پاس کر لیا۔

یہاں میں اردو کے اس نصاب کے بارے میں کچھ اور بتانا چاہتا ہوں جو اس زمانے میں رائج تھا۔ شاعری میں ایک ہی کتاب مقرر تھی۔ اس کا عنوان تھا ''نظمِ منتخب'' اور یہ کتاب آزادی سے پہلے کی انڈین آرمی کے ان انگریز افسروں کے لیے مرتب کی گئی تھی جو اردو پڑھنا اور انڈین آرمی کے اردو امتحانات دینا چاہتے تھے۔ کتاب ویسے بری نہیں تھی۔ اس میں ولی کے زمانے سے لے کر اکبر الٰہ آبادی کے زمانے تک کے بڑے بڑے شعرا کے کلام کا انتخاب تھا۔ بعض لمبی نظمیں پوری کی پوری اس میں شامل تھیں۔ مثال کے طور پر میر انیس کا مرثیہ ''جب قطع کی مسافتِ شب آفتاب نے'' اور حالی کا مسدس۔ اکبر کے بعد کے کسی شاعر کا انتخاب اس میں نہیں تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ کتاب ۱۹۰۹ میں مرتب کی گئی تھی۔ اس کتاب کی ایک خصوصیت تھی جس پر مجھے ہنسی آئی۔ وہ یہ کہ اس میں کوئی ایسا شعر نہیں تھا جس میں انگریزوں پر تنقید کی گئی ہو۔ ظاہر ہے کہ اکبر کے سب سے زیادہ جاندار اشعار اس میں ناپید تھے۔ مجھے یہ جان کر بڑا تعجب ہوا کہ SOAS کے نصاب میں اقبال کی بھی کوئی نظم نہیں تھی۔ اس زمانے میں یہ عام اصول تھا کہ کسی انتخاب میں ایسے شاعر یا ادیب کی تصنیف نہیں ہونی چاہیے جو اس وقت زندہ ہو۔

لیکن اقبال کی وفات نو سال پہلے ہو چکی تھی۔ جب میں نے اپنے ہندوستانی دوستوں کو یہ بتایا تو ان کو ـــ بجا طور پر ـــ حیرت ہوئی۔ بعد میں مجھے احساس ہوا کہ اس کی اصل وجہ کیا ہے۔ میرے استاد A.H. Harley تھے اور انھوں نے نصاب میں صرف وہی کتابیں رکھی تھیں جو انھوں نے خود ایک پرانے استاد سے پڑھی تھیں جسے وہ ہمیشہ "My old munshi" کے الفاظ سے یاد کرتے تھے۔ میں ہارلی صاحب کے پہلو میں بیٹھا ''نظمِ منتخب''

پڑھتا تھا۔ اس کے حاشیے بہت چوڑے تھے اور وہ تمام ان نوٹس سے بھرے ہوے تھے جو "My old munshi" نے لکھائے ہوں گے۔ میں اس بات کو ثابت تو نہیں کرسکتا لیکن پھر بھی مجھے یقین ہے کہ ہارلی صاحب کوئی کتاب، کوئی نظم، یا کوئی شعر نہیں پڑھا سکتے تھے جسے "My old munshi" نے ان کو نہ پڑھایا ہو۔ اس بات کی تائید اس بات سے ہوتی ہے کہ جب میں نے ہارلی صاحب کو بتایا کہ میں نصاب میں اور چیزیں شامل کرنا چاہتا ہوں تو انھوں نے فوراً کہا، ''مگر ان نئی چیزوں کو آپ کیسے پڑھائیں گے؟'' میں نے کہا کہ جب کوئی بات میری سمجھ میں نہ آئے گی تو میں بلگرامی سے اس کی تشریح کرنے کو کہوں گا۔ میرے اس جواب سے ان کو تعجب ہوا، لیکن وہ خاموش رہے۔ (بلگرامی کا ذکر آگے چل کر آئے گا۔)

نثر کی کتابوں کی ایک نامکمل فہرست میں پہلے دے چکا ہوں۔ ان کے علاوہ رتن ناتھ سرشار کے ''فسانۂ آزاد'' کا ایک چھوٹا سا انتخاب تھا جس کا عنوان ''آزاد کے کارنامے'' رکھا گیا تھا۔ اسی طرح کا ایک دوسرا انتخاب ''خوجی کے کارنامے'' تھا، لیکن وہ ہمارے نصاب میں نہیں تھا۔ ظاہر ہے کہ ''آزاد'' اور ''خوجی'' کی یہ علیحدگی طالب علموں کے لیے مفید نہیں تھی، بہر حال —

ہارلی کے علاوہ دو استاد تھے جنھوں نے مجھے پڑھایا۔ Captain A.R. Judd اور حامد حسن بلگرامی۔ جڈ صاحب ایک علیحدہ مضمون کے مستحق ہیں۔ ("Urdu and I" میں ان کا ذکر ذرا زیادہ تفصیل سے ہے اور شان الحق حقی نے بھی ان کے بارے میں کچھ لکھا ہے۔) یہاں صرف ایک واقعہ بتانا چاہتا ہوں جس سے ان کی ایک خصوصیت کا پتہ چلتا ہے۔ وہ مجھے ''فسانۂ آزاد'' کا وہ انتخاب پڑھا رہے تھے جس کا ذکر میں نے ابھی کیا ہے۔ اس کی زبان سے وہ بے حد محظوظ ہوتے تھے اور بار بار پوچھتے ''یہ بہت ہی اچھی کتاب ہے۔ کس نے لکھی؟'' میں بتاتا رہا۔ صاف پتہ چلتا تھا کہ سرشار کا نام ان کے لیے بالکل اجنبی تھا۔ اگر اردو ادب سے دلچسپی ہوتی تو ظاہر ہے انھیں معلوم ہوتا کہ سرشار کون تھا۔ مگر واقعہ یہ تھا کہ ان کو صرف زبان سے دلچسپی تھی، اور خود کہتے تھے کہ ''مجھے اردو کے محاوروں اور ضرب الامثال سے دلچسپی ہے۔'' لیکن زبان پر وہ عبور تھا جو میں نے کبھی کسی اور انگریز میں نہیں دیکھا۔

حامد حسن بلگرامی ایک عہدے پر مقرر تھے جسے SOAS کی اصطلاح میں Overseas Lecturership کہتے تھے۔ خدا جانے ان کا تقرر کیسے ہوا تھا۔ انھوں نے کبھی کسی یونی ورسٹی میں نہیں پڑھایا تھا۔ SOAS آنے سے پہلے وہ ڈون اسکول دہرہ دون میں پڑھاتے تھے اور ان

کی واحد تصنیف ایک چھوٹی سی کتاب ''خلاصہ نگاری'' تھی جو انھوں نے اسکول کے طالب علموں کے لیے مرتب کی تھی۔ ادب کا مطالعہ کافی محدود تھا۔ فیض کو وہ ہمیشہ ''فیض محمد فیض'' کہتے تھے اور اقبال کے متعلق ایک دفعہ کہا (انگریزی میں) "Some mature minds consider that it is too soon to write about him. I myself have not written about him."
ہارلی کا رویہ ان دونوں استادوں کے ساتھ بالکل انگریزی راج کے پرانے انگریزوں کا تھا۔ سمجھتے تھے کہ چونکہ ان کا عہدہ ان دونوں سے برتر ہے اس لیے یہ ضروری ہے کہ ہر معاملے میں اپنی برتری کا اظہار کریں۔ یہی وجہ تھی کہ جب میں نے کہا ''جب کوئی بات میری سمجھ میں نہیں آئے گی تو میں بلگرامی سے پوچھوں‌گا'' توان کو تعجب ہوا۔ سمجھے ہوں گے کہ کسی ہندوستانی سے اپنی لاعلمی کا اظہار کرنا کسی انگریز کے شایانِ شان نہیں۔ رہے جڈ، تو ہارلی کی نظر میں ان کی کوئی خاص حیثیت نہیں تھی۔ وہ ایک معمولی گورے سپاہی بن کر ہندوستان گئے تھے اور صرف دوسری عالمی جنگ کے غیر معمولی حالات کی بنا پر کپتان بنا دیے گئے تھے۔ انھوں نے کبھی اعلیٰ تعلیم نہیں پائی تھی۔ بی۔ بی۔ سی۔ والی انگریزی نہیں بول سکتے تھے اور ان کا لب و لہجہ خاص Norfolk کا تھا جہاں وہ پیدا ہوے اور پلے بڑھے تھے۔ ہارلی کی نظر میں قابلِ قدر صرف ان کا اردو پر حیرت انگیز عبور تھا اور بس۔ اس میں ہارلی کا اور ان کا کوئی مقابلہ نہیں تھا، لیکن ہارلی کے لیے اس بات کا اعتراف ممکن ہی نہیں تھا۔ ایک واقعہ مجھے یاد ہے۔ جڈ مجھے پڑھا رہے تھے کہ ہارلی کمرے میں داخل ہوے۔ دسمبر کی چھٹّیاں شروع ہونے والی تھیں اور ہارلی نے مجھ سے پوچھا ''آپ چھٹیوں میں پڑھنے آتے رہیں گے؟'' میں نے کہا ''جی ہاں، میں سمجھتا ہوں کہ اگر میں مسلسل کام کرتا رہوں تو کافی ترقی کر سکتا ہوں۔'' ہارلی نے کہا 'مسلسل' نہیں 'سلسلے وار'۔'' ان کے جانے کے بعد جڈ نے کہا کہ ''ان سے نہ کہیے گا، مگر 'مسلسل' ہی ٹھیک تھا۔''

خیر، یہ تھیں میرے استادوں کی کوتاہیاں۔ لیکن ان کوتاہیوں کے مقابلے میں تینوں کی خوبیاں کہیں زیادہ تھیں۔ ہارلی بچارے بوڑھے ہوگئے تھے اور لندن سے کافی دور رہتے تھے لیکن اپنے آرام کی فکر بالکل نہیں کرتے تھے۔ یونی ورسٹی کی تعطیلوں میں بھی وہ نہ صرف خود SOAS پڑھانے آنے کے لیے تیار تھے بلکہ یہ بھی چاہتے تھے کہ میں بھی وہاں آؤں اور ان سے پڑھوں۔ اور عام طور پر میں آتا تھا۔ جڈ نے مجھے اتنی اردو سکھائی کہ کوئی دوسرا انگریز نہیں سکھا سکتا تھا۔ بلگرامی نے بھی پڑھانے میں بڑی محنت کی اور جیسے

انگریزی میں کہتے ہیں out of the way جا کے میری مدد کرنے کے لیے تیار رہتے تھے۔ جب میں ۱۹۴۹ میں لیکچرر مقرر ہوا اور ہندوستان اور پاکستان جانے کی تیاریاں کر رہا تھا تو انھوں نے مجھے ذاکر حسین، احتشام حسین، مولوی عبد الحق اور بعض دوسرے ''بڑے آدمیوں'' کے نام تعارفی خط لکھ کے دیے، جس سے مجھے بڑی سہولت ہوئی۔

یونی ورسٹی کے استادوں کے علاوہ میرے بعض ہندوستانی دوستوں نے میری بہت مدد کی۔ ہمیشہ سے میرا خیال ہے کہ جب تک آپ اردو روانی سے اور اچھی خاصی صحت کے ساتھ نہ بول سکیں یہ دعویٰ نہیں کرسکتے کہ آپ کو اردو آتی ہے۔ اس لیے میں نے اردو میں گفتگو کرنے کی مشق کرنی چاہی۔ دو اردو داں، بلکہ اہلِ زبان، دوستوں نے باقاعدہ ملاقاتیں کر کے اس میں میری مدد کی۔ ایک حیدرآباد دکن کی خاتون سردار محبوب اور ایک یو۔ پی۔ کے صاحب مقبول احمد جو بعد میں علی گڑھ میں پروفیسر ہو گئے۔ ...

اس کے بعد اردو سیکھنے کے عمل کی (محدود معنوں میں) تکمیل ۱۹۵۰-۱۹۴۹ میں ہوئی۔ ظاہر ہے کی ''تکمیل'' کی منزل کبھی نہیں آتی، لیکن اس تعلیمی رخصت کے ایک سال میں میرا روانی سے اردو بولنا جاری رہا اور میرے اردو الفاظ کے ذخیرے میں بھی خاصا بڑا اضافہ ہوا۔

*

اب میں تاریخ کی ترتیب کو چھوڑ کر علیحدہ علیحدہ موضوعات پر اپنے خیالات کا اظہار کرنا چاہوں گا جو وقتاً فوقتاً ذہن میں آتے رہتے ہیں۔

اردو کی بعض خصوصیتیں

ان قریب قریب ساٹھ سال کے دوران جن میںمجھے زیادہ سے زیادہ اردو سمجھنے، بولنے، پڑھنے اور لکھنے کا تجربہ رہا ہے میں نے محسوس کیا ہے کہ اردو زبان اور اردو تحریر کے اسلوب میں بعض باتیں ہیں جن کو میں نے کسی دوسری زبان میں نہیں دیکھا۔ ان میں سے کچھ یہ ہیں:

(۱) مبالغہ۔ اردو والوں کے مزاج میں ایک قسم کی انتہا پسندی ہے۔ میں نے اکثر دیکھا ہے کہ میرے انگریزی مضامین کے مترجموں نے اکثر میرے محتاط بیانات کا ترجمہ ایسے جملوں میں کیا ہے جن میں میری احتیاط کی بو تک نہیں آتی۔ ایسے ترجموں کو غلط کہنا غالباً زیادہ صحیح نہیں ہوگا کیوں کہ اردو کا محاورہ یہی ہے (حالانکہ میں ان جملوں میں

ترمیم کرنا ضروری سمجھتا ہوں!)۔

(۲) اردو لکھنے میں لکھنے والا عام طور پر ایسی تکلف کی زبان لکھنا پسند کرتا ہے جو میرے نزدیک نہ ضروری ہے نہ مناسب۔ بہت سے لکھنے والے فارسی کے استعمال سے اپنی تحریر میں ایک خاص شان پیدا کرنا چاہتے ہیں اور اکثر پڑھنے والے غالباً سمجھتے ہیں کہ اس سے واقعی ایک خاص شان پیدا ہوئی ہے۔ ان کو یہ بات پسند ہے۔ اور مجھے بالکل پسند نہیں! جب آپ ''اس کے علاوہ'' لکھ سکتے ہیں تو خواہ مخواہ ''علاوہ از ایں'' کیوں لکھتے ہیں؟

حال ہی میں ایک صاحب نے مجھے ایک خط میں لکھا ہے ''آپ کا گرامی نامہ موصول ہوا۔'' اگر اس کے بجائے وہ لکھتے ''آپ کا خط ملا'' تو اس میں کیا برائی ہوتی؟ (اسی بات کی بے شمار مثالیں دی جاسکتی ہیں۔) اس کے علاوہ (''علاوہ از ایں'') ایک اور بات ہے۔ بعض لوگوں کو اپنی فارسی دانی کی نمائش کرنے کا بڑا شوق ہے، اور یہ جانتے ہوے کہ اب کم لوگ ہیں جنھیں فارسی آتی ہے جان بوجھ کے فارسی کے اشعار نقل کریں گے۔ خیر، اگر آپ کو کسی موقعے پر کسی فارسی شعر کو نقل کرنا موزوں معلوم ہوتا ہے تو ضرور نقل کیجیے، مگر اس کے ساتھ اردو ترجمہ بھی دیدیجیے تاکہ لوگ آپ کا مطلب سمجھ سکیں۔ جو ترجمہ نہیں دیتے، معلوم ہوتا ہے کہ ان کے دل میں یہ مکالمہ ہو رہا ہے:

سوال: کیا آپ اس کا ترجمہ کر سکتے ہیں؟

جواب: (جھوٹے تعجب کے ساتھ) اچھا؟ آپ کو فارسی نہیں آتی؟ معاف کیجیے، میں سمجھتا تھا کہ ہر پڑھا لکھا آدمی فارسی جانتا ہے۔

(ویسے اردو والوں پر کچھ موقوف نہیں۔ بہت سے انگریز مصنف — اب بھی، اگرچہ پہلے کے مقابلے میں کم — اپنی تحریروں میں فرانسیسی اور لاطینی کے اشعار یا عبارتیں نقل کرتے ہیں حالانکہ خوب جانتے ہیں کہ وہ زمانہ کبھی کا گزر گیا جب تعلیم یافتہ انگریز یہ زبانیں جانتے تھے۔)

(۳) cliches کا استعمال۔ (پتہ نہیں کہ cliches کا اردو ترجمہ کیا ہوگا۔) cliche انگریزی میں ایسے لفظ کو کہتے ہیں جو سیدھے سادے الفاظ کے بجائے ذرا زیادہ اثر پیدا کرنے کے لیے استعمال کیے جاتے تھے اور جو ایک زمانے میں واقعی یہ اثر پیدا کرتے بھی تھے مگر اب بار بار استعمال ہونے کی وجہ سے اتنے پٹے ہوے معلوم ہوتے ہیں کہ پڑھنے والے کو کوفت ہوتی ہے۔ ویسے یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ انگریز پڑھنے والے کو کوفت ہوتی ہے۔ مجھے معلوم ہوتا

ہے کہ اردو پڑھنے والے یہ محسوس ہی نہیںکرتے۔ مثال کے طور پر یہ لکھنے کے بجائے کہ کتاب ''چھپی ہے'' لوگ لکھیں گے کہ وہ ''زیورِ طبع سے آراستہ ہوئی۔'' یہ مجھے مضحکہ خیز الفاظ معلوم ہوتے ہیں، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اردو پڑھنے والوں کا یہ ردِ عمل بالکل نہیں ہوتا۔

(٤) اسی سے متعلق ایک اور بات ہے جسے میں نے اکثر دیکھا ہے۔ آپ کسی خاص موضوع پر مضمون یا کتاب لکھ رہے ہیں۔ اصل موضوع پر آنے سے پہلے آپ تمہید کے طور پر ایک ایسی بات بتانا ضروری سمجھتے ہیں جس سے آپ کا ہر قاری پہلے سے بہت ہی اچھی طرح واقف ہے۔ احتشام حسین کی ایک کتاب اردو زبان کے بارے میں ہے۔ کتاب اس وقت میرے پاس نہیں، لیکن اگر مجھے صحیح یاد آتا ہے تو اس کا پہلا جملہ ہے '' ہر بچہ کوئی نہ کوئی زبان بولتا ہے''۔ بھلا بتائیے، یہ کون نہیں جانتا کہ '' ہر بچہ کوئی نہ کوئی زبان بولتا ہے''؟ حال میں میں نے انڈیا کے قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان کے رسالے ''اردو دنیا'' کے ایک شمارے میں ایک ڈکشنری پر تبصرہ پڑھا۔ اس کے پہلے پیراگراف میں قاری کو بتایا گیا ہے کہ ڈکشنری کس چیز کو کہتے ہیں اور اس کا مصرف کیا ہے۔ تبصرہ نگار سے یہ پوچھنے کو جی چاہتا ہے کہ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ ایسے مضمون کا پڑھنے والا نہیں جانتا کہ ڈکشنری کیا ہے اور اس کا مصرف کیا ہے؟

(٥) اردو میں اپنے قصور کا صاف صاف اعتراف کرنا محاورے کے خلاف ہے۔ اگر کسی صاحب کے خط کا جواب دینے میں بہت دیر ہوگئی ہو تو میں لکھوں گا، ''مجھے افسوس ہے کہ آپ کے خط کا جواب میں اس سے پہلے نہیں لکھ/دے سکا،'' حالانکہ میں لکھ سکتا تھا، اور ایمانداری کا تقاضا تھا، لیکن ''میں نہیں لکھ/دے سکا۔'' نہیں، ''میں نے نہیں لکھا/دیا'' لکھنا چاہیے۔ لیکن یہ اردو کا محاورہ نہیں۔

[مسلسل]